اِنسان، مصنف، مصنف گر

پچاس سال! پچاس سال۔ اور وہ بھی ہجری نہیں، عیسوی۔ نصف صدی، اور وہ بھی قمری نہیں شمسی، مدت کچھ تھوڑی ہوئی! اللہ اکبر! عمریں بیت گئیں۔ ایک نہیں دو دو پشتیں گزر گئیں۔ بچے بوڑھے ہو گئے۔ اور جوان بوڑھے پھوس ہو کر رہ گئے۔ جو کنوارے تھے وہ پوتوں والے ہو گئے۔ اور جن کے قد تیر کی طرح سیدھے تھے وہ جھک جھک کر کمان بن گئے۔ تاریخ اور جنتری سے پوچھیے تو یہ جواب پائیے۔ اور حساب پائیے۔ لیکن غفلت کی تھپکیوں میں اگر آجائیے اور بھروسا محض اپنی یادداشت پر رکھیے۔ تو ایسا لگنے لگے کہ جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء کو دن بھی ابھی کے گزرے ہیں۔ کل رات ہی کا تو خواب ہے! وہ دیکھیے دار المصنفین کا خاکہ تیار ہو رہا ہے۔ دستور العمل بن رہا ہے۔ مجلس انتظامی کے رکن ملک بھر سے چھانٹ چھانٹ کر لیے جا رہے ہیں۔ ہونہار اور نوعمر رفیق چنے جا رہے ہیں۔ علم و قلم کی بساط پر ایک نئی مجلس مرتب ہو رہی ہے۔ تحقیق و تصنیف کی مسند پر جلوہ آرا ہو رہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی یا ایک بے چیدان کی زبان میں سلیمان اعظم اور انتظام عمارت، طبع و اشاعت کے میر لشکر بنے ہوئے ہیں۔ انھیں کے رفیق و صدیق، ہم دم و ہم قدم مولوی مسعود علی ندوی یا ایک بے ادب کی زبان میں سالار مسعود غازی! کیا زمانے تھے، کیا جوش تھا اور کیسے بلند جذبات تھے! کیا کیا حوصلے، کیا کیا ولولے! اور سب سے بڑھ کر ایک عزم صمیم۔ کام کی دھن۔ خدمت کی لگن!

اور یہ ساری آگ لگائی ہوئی اور روشنی پھیلائی ہوئی کس کی تھی! ایک بڑے میاں کی۔ جو شترا اور راشی کیا معنی ابھی ساٹھ برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ "بڑے میاں" بن گئے تھے۔ ابھی اپنی بھرپور جوانی ہی میں تھے

---

[1] یہ وہ مقالہ تمام و کمال ہے جو ۲۱ر فروری کو دار المصنفین کی طلائی جبلی میں پڑھ کر سنایا تھا۔

کہ ملک بھر میں اپنا سکہ بٹھا چکے تھے۔ اور علامہ کہلانے لگے تھے۔ اور علوم و معارف کی مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے سینکڑوں دماغ روشن کر چکے تھے۔ تو ذرا ۱۰، ۲۰، ۲۵ منٹ کا وقت نکال کر اسی مرد خدا کی داستان حیات کی کچھ سطریں پڑھ لیجئے، داستان کچھ اس کی شخصیت کی اور کچھ اس کی کارگزاری کی۔ اس کی کاریگری کی۔ کہانی ناتمام سی، ادھوری سی اسرسری سی، بلکہ یوں کہیے کہ آڑی پڑی سی۔

(۱) شخصیت

2

اپنے ہوش کی آنکھیں ابھی کچھ کھل ہی چلی تھیں، اور زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے ختم اور بیسویں صدی کے شروع ہونے ہی کا تھا کہ کانوں میں نام مولانا شبلی کا عظمت و توقیر کی راہ سے پڑنے لگا۔ اکثر حالی کے ساتھ عطف ہو کر، اور کبھی ان سے ہٹ کر، بلکہ کبھی کٹ کر بھی۔ شہرت یہی سننے میں آئی کہ مولانا علم و فضل کے پیکر ہیں۔ اور ایک ہمہ داں اور تاریخ کے بحر بیکراں نثر کے تاجدار، تو نظم کے بھی شہسوار۔ کچھ اور تمیز آئی تو الندوہ باقاعدہ پڑھنا شروع کیا۔ اور اس نے مولانا کے علم و فضل کا نقش دل پر اور گہرا کر دیا۔ ۱۹۰۷ء میں والد ماجد کے ہمراہ لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کے جلسہ دستار بندی میں شرکت کی۔ اور وہیں پہلی بار مولانا کی زیارت کے ساتھ دو کتابیں بھی مولانا کی خرید کر لیں۔ ایک ان کی معروف متکلمانہ کتاب الکلام۔ دوسری تاریخی رسائل شبلی۔ نویں درجہ کے اسکولی طالب علم اور ۱۴، ۱۵ کے سن کے لڑکے کی بساط ہی کیا تھی کتابیں پڑھیں اور تھوڑی بہت سمجھیں۔ تو آنکھیں کھل گئیں۔ اور ایک عالم ہی دوسرا نظر آنے لگا۔ الکلام میں علمی، کلامی، فلسفیانہ بحثیں وجود باری، رسالت، معجزات، عقیدہ آخرت پر تھیں۔ اور رسائل میں بعض بڑے معرکے کے تاریخی مسئلوں کا حل تھا۔ مضمون اس کے سارے ہی اہم تھے۔ لیکن یہ تین مقالے تو دل کی گہرائیوں میں اتر گئے اور دماغ پر نقش ہو گئے۔ ایک کتب خانہ اسکندریہ، دوسرے حقوق الذمیین تیسرے جزیہ کی تحقیق۔ دونوں کتابوں کے لکھنے والے سے عقیدت گہری سی گہری پیدا ہو گئی۔ اور اب الندوہ کا انتظار ہر مہینے بے تابی سے رہنے لگا۔ اور زیب عالمگیر پر الندوہ میں قسط وار مضمون سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ سوتے جاگتے شبلی ہی کا خیالی پیکر نظر کے سامنے رہنے لگا۔ سال ہی ڈیڑھ سال بعد کالج میں پڑھنے کے لیے لکھنؤ منتقل ہو آیا۔ اور اخیر ۱۹۰۸ء کی دوسری ششماہی کی کوئی تاریخ ہو گی، جب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

اف وہ پہلی اصالتہً حاضری[1]! کتنی مودبانہ، کتنی عقیدت مندانہ اور کیسی پرستارانہ تھی! نام بتلانے اور معمولی

---

[1] اصالتہً اس لیے کہ والد ماجد کے ہمراہ تبعاً تو ۱۹۰۷ء میں حاضری ہو چکی تھی۔

سوالوں کا جواب دینے میں زبان لڑکھڑانے لگی، ہمت جواب دے دی گئی۔ خیر اس پہلی ملاقات کے بعد راہ کھل گئی۔
سلسلہ شروع تو آمد و رفت، رک رک کر کئی کئی دن بعد ہوتی رہی۔ اور پھر جلد ہی جلد ہونے لگی کبھی تنہا اور کبھی اس
کے رفیق خصوصی مولوی عبدالباری ندوی کے ساتھ۔ ملاقات کا عام وقت سہ پہر کا تھا۔ ادھر سہ پہر ہوا، اور ادھر
خود کو داستان شبلی کی طرف اٹھ گئے۔ اس وقت مولانا کی حیثیت گویا پیر و مرشد کی تھی۔ سیاست ہو یا مذہب شاعری
ادب، تاریخ ہو یا فلسفہ، علم و فن کے ہر شعبہ، ہر شاخ میں مرجعیت انھیں کو حاصل۔ وہ امام میں مقلد وہ رہنما میں
، وہ طبیب میں مریض۔ مولانا کا قیام اپنی وفات (نومبر ۱۹۱۴ء) سے کچھ قبل تک عموماً و بیشتر لکھنؤ ہی میں رہا۔ یہ
ہے کہ کبھی کبھی لمبی مدت کے لیے وہ بمبئی، حیدرآباد وغیرہ بھی آتے جاتے رہے۔

اسی درمیان میں ایک دور وہ بھی آیا۔ جب مغربیت کے اثر سے میرے اوپر نشۂ الحاد کا سوار ہوگیا۔ اور مل، اسپنسر
وغیرہ کے بھرے میں آکر میں مذہب ہی سے فرنٹ ہوگیا۔ فخر بجائے اسلام کی حلقہ بگوشی کے "ریشنلزم" یا عقلیت
مادیت پر کرنے لگا۔ اور مذہب پر کچھ زور نہ چلا، تو ساری جھنجھلاہٹ شبلی کی الکلام ہی پر اتاری قلم چلانے کی الٹی سیدھی
مولانا ہی کے فیض سے ہوگئی تھی۔ پہلا ہاتھ انھیں پر صاف لیا۔ کئی کئی نمبر الکلام کی رد و قدح میں لکھنؤ کے ایک ماہنامہ
میں "ایک طالب علم" کا نقاب ڈال کر لکھ ڈالے۔ حاضری کے معمول میں فرق تو کچھ اسی زمانہ میں قدرۃً آیا۔ لیکن بہت
اس زمانے میں کبھی نہ آنے پایا۔ یہ نیازمندی ادھر سے تھی ادھر مولانا کی بزرگانہ شفقت تھی کہ لکھنے والے کا نام پہچان
لینے کے بعد بھی نہ مٹی، نہ گھٹی۔

مولانا نے مکان اس درمیان میں کئی بدلے کم سے کم دو تو لہ گنج ہی کے آس پاس۔ اور پھر جب امین آباد میں گھنٹہ
گھر تیار ہوگیا، غالباً ۱۹۱۱ء میں تو اسی بالاخانہ نمبر ۵۳ پر منتقل ہو آئے۔ سیرت نبوی کا جب مستقل کام ۱۹۱۲ء میں
شروع ہوگیا تو ضرورت ایک چلتے ہوئے انگریزی مددگار کی ہوئی۔ جو انگریزی ماخذوں سے معلومات تلاش کر کے اور ترجمہ کر کے پیش
کرے۔ پہلے اس خدمت پر تقرر گھنٹے دو گھنٹے روزانہ کام کے لیے ماہانہ معاوضہ پر اسی خاکسار کا کیا (بی اے کی سند اسی سال مل
چکی تھی) اور اس تقریب سے حاضری اور ہم نشینی کے موقع اور زیادہ ملنے لگے۔ اور وقت کے علاوہ بے وقت...... بلکہ
کبھی کبھی، اور جب مولانا سفر میں تشریف لے جاتے تو مراسلت بھی پابندی سے جاری رہتی۔ جلوت کی صحبتوں کے ساتھ خلوت
کی نشستوں کے موقع ملنے لگے۔ اور انگریزی کام سے مولانا کی جو خط و کتابت ہوتی رہتی۔ اسی خدمت کا ابھی ایک سال
ہوا تھا۔ ندوہ کے معاملات میں دوسروں سے جو نوک جھونک چل جاتی اس میں بھی ایک حد تک دخیل اپنی طالب علمانہ
ہوگیا ـــ صیغۂ متکلم کے بار بار اور ساتھ ہی خواہش استعمال سے عجیب نہیں کہ طبیعت اکتا چلی ہو تو غرض اس

ساری درازنفسی سے یہ ہے کہ علامہ کی شخصیت پر جو گزارش پیش ہو رہی تھی۔ اس کی بنیاد نہ سنی سنائی باتیں نہ واسطہ در واسطہ روایتیں بلکہ بہت کچھ دیکھا سنا ہوا ہے۔ اور "شنید" سے بڑھ کر "دید" کا حصہ ہے۔

اس زمانے میں مولانا تجرد کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اہل خانہ وفات پا چکی تھی۔ اور صاحبزادے کہیں اپنی ملازمت پر تھے۔ مکان کے مکین بس مولانا خود تھے۔ اور ایک افیونی قسم کے خدمت گار کہ وہی کھانا بھی پکا دیتے تھے اور کھانا کچھ ہی کیا تھا۔ بڑے کم خور تھے۔ جوانی میں سنا ہے کہ شہ زور تھے عجب نہیں کہ خوش خور بھی ہوں۔ مگر اب تو غذا بہت ہی قلیل ہو گئی تھی۔ یہ ہو کر معمولات روزانہ یہ تھے کہ رات میں سویرے ہی سو جاتے اور ادھر بہت تڑکے منہ اندھیرے اٹھ بیٹھتے۔ پھر تو چائے کا بھی معمول اسی وقت کا تھا۔ خدمت گار صاحب کو یہی ڈیوٹی کھل کر رہتی۔ مولانا چائے کے رسیا تھے۔ اور چائے سے بھی بڑھ کر شکر کے۔ شکر دان میں دانہ دار شکر رکھی ہوئی ہے اور مولانا اسی سے شغل فرماتے جاتے ہیں قلم میں شیرینی چاہے کچھ اسی شکر خوری سے آگئی ہو لیکن بھوک پر تو بڑا ہی برا اثر شکر اور چائے کی افراط کا پڑتا ہی تھا۔ ابھی کچھ اندھیرا ہی ہوتا کہ لیمپ جلا کر بیٹھ جاتے اور لکھنے کا کام صبح ہی کے دو گھنٹے کے اندر کر ڈالتے دن کا بڑا حصہ کتابوں کے اوراق کی الٹ پلٹ کی نذر ہوتا۔ مطالعہ کے شوقین نہیں حریص تھے، دن کا کھانا اول ہی وقت کھا لیتے۔ شام کے کھانے سے اخیر زمانے میں مغرب سے پہلے ہی فراغت کرتے۔ اکثر ہم بیٹھنے والوں کے سامنے ہی اور کھانا ہوتا کیا؟ امین آباد کے چٹپٹے کباب بس ایک دو سے زیادہ نہیں۔ اور پھلکے وہ بھی بس ایک ہی آدھ۔ رساول خوب میٹھی کھاتے۔ اور ایک رساول کیا ہر مٹھائی خوب ہی تیز چاہتے۔ ریل کے سفر میں اسٹیشنوں سے مٹھائی خرید خرید کر تناول فرماتے۔

مزاج جذباتی تھا۔ سردی گرمی دونوں کا احساس بڑا نازک رکھتے۔ سردی کی راتوں میں معمولی رضائی، کمبل، لحاف ناکافی ثابت ہوتے لیکن پانی غیر معمولی طور پر ٹھنڈا چاہتے۔ ایک بار کیا ہوا کہ ۱۳ء کے آخری ہفتہ دسمبر میں لکھنؤ میں شب کو غریب خانہ کھانے پر تشریف لائے۔ ایک دوست کی فرمائش پر عزیز لکھنوی اور شہر کے دو نامور ہندوؤں کو بھی بلوا دیا تھا۔ ایک پنڈت برج نارائن چکبست شاعر، دوسرے پنڈت بشن نرائن بیرسٹر اور کانگریس کے سابق صدر کھانے پر مولانا نے پانی طلب فرمایا۔ اور جب پیش ہوا تو بولے "برف نہیں ہے" اتنے کڑکڑاتے جاڑے میں رات کے وقت کسی کو خیال بھی برف کا ہو سکتا تھا۔ اور اس وقت تو تلاش سے امین آباد میں بھی نہ ملتی۔ میں شرمندگی سے پانی پانی مزاج میں بھی حدت و شدت اسی مناسبت سے تھی۔ اور شاید اس لیے رفیقوں سے اکثر ان بن رہتی۔ غم و صدمہ کا اثر بھی قلب بہت محسوس کرتا۔ چھوٹے بھائی اسحاق مرحوم تو خیر سگے بھائی ہی تھے۔ ان کی وفات نے تو مولانا کی کمر توڑ دی۔ ا[illegible] کا مرثیہ تو وہ مضطر و بیقرار ہو کر کہتے ہی باقی غیروں کے مرثیے بو[illegible]سوں نے کہے ہیں۔ ان میں سوز و گداز چھپا پڑتا ہے۔ تو

والد مرحوم کا انتقال ۱۲ء کے اخیر میں مکہ معظمہ میں ہوا۔ میں نے ایک ٹوٹا پھوٹا ماتمی مضمون اس وقت کے ہفتہ وار مشرق (گورکھپور) میں لکھا۔ مولانا نے اسے پڑھا اور نو مشقی کی ساری خامیوں کے باوجود مضمون کی داد اس کی غم انگیزی کی حیثیت سے دی۔ خواجہ حسن نظامی اور پریم چند کے افسانوں میں جو رقت انگیز ٹکڑے آجاتے تھے مولانا کے آنسو ان پر نکل پڑتے تھے میرانیس کے مرثیوں سے اتنا متاثر بھی اسی رقیق القلبی کا اثر تھا۔ محسن الملک مرحوم، جسٹس سید محمود مرحوم کی وفات اور مدار المہام رامپور جنرل عظیم الدین خاں کے واقعہ قتل سے قلب نے بڑا اثر لیا تھا۔ اور اس کا اظہار زبان یا قلم سے، نظم میں یا نثر میں ہو کر رہا۔ اپنے معاصرین میں حالی کے بڑے معترف رہا کرتے۔ میں علامہ کے اور کمالات کا قائل تو تھا ہی لیکن ان کی سخن فہمی کو اپنا جزو ایمان بنائے ہوئے تھا۔ اور معمول کچھ ایسا بنا لیا تھا کہ جب کوئی شعر پسند آجاتا تو اسے کسی نہ کسی بہانے مولانا کے کان تک ضرور پہونچا دیتا۔ اب اگر کہیں انھوں نے داد دے دی یا میرے انتخاب پر صاد کر دیا، تو جیسے مجھے سب کچھ مل گیا لیکن اگر کہیں انھوں نے خاموشی یا بے رُخی برتی تو معاً وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا ——— ایک بار اپنے دل کی یہی بات بے تکلف گوش گزار کر دی۔ بولے کہ "خیر میرے لیے تو یہ محض حسن ظن ہے۔ البتہ مولانا حالی کا درجہ سخن فہمی میں واقعی ایسا ہی ہے۔ میں ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھتا تھا۔" عالی ظرفی کی ایک متعین مثال اس سے اونچی سُنیے۔

ثاقب اکبر الہ آبادی ثم لکھنوی کا شمار لکھنؤ کے اہل زبان میں تھا۔ ۱۳ء میں مولانا نے مسجد کانپور کے مشہور حادثہ سے متعلق ایک نظم کہی۔ مضمون ایک جگہ پولیس کی گولیوں سے بوڑھوں اور بچوں دونوں کی شہادت کا تھا۔ ایک شعر موزوں یوں ہوا تھا ؎

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں

کہ لڑکے ہیں بہت جلد ان کو سو رہنے کی عادت ہے

ثاقب ملنے آئے۔ تو انھیں سُنایا۔ ثاقب نے کہا کہ دوسرے مصرعہ میں اگر دو ایک الفاظ بدل دیئے جائیں تو مصرعہ اور چست ہو جائے۔ "لڑکے" کی جگہ "ننھے بچے"۔ "بہت جلد" کی جگہ "سویرے" اور "سو رہنے" کی جگہ "سو جانے" مولانا نے بلا تامل اس مشورے کو قبول کیا۔ اور اب مصرعہ یوں ہو گیا۔ ع

کہ ننھے بچے ہیں، سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے

معاصر کی عظمت کا اعتراف بھی کوئی آسان بات نہیں۔ چہ جائیکہ اس کی اصلاح کو قبول کر لینا۔ پھر خصوصاً جب وہ معاصرین میں بھی اپنے سے چھوٹا ہو۔ اور شہرت میں بھی کمتر ہو، یہ انصاف پسندی اور یہ عالی ظرفی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ دینی غیرت مندی کے پُتلے تھے۔ خود عبادات میں چاہے ڈھیلے ہوں بعض عقائد کی تاویل میں بھی چاہے عقل پرستوں

کی صف میں جا ملے ہوں۔ لیکن جہاں تک دین کی حمیت و غیرت کا سوال ہے۔ ان کے قدم کسی بڑے سے بڑے
سے پیچھے نہ ہوں۔ اور آریہ ہوں یا عیسائی، ملحد ہوں یا مستشرق، طنز و تعریض کی زد کسی سمت سے بھی اسلام پر
دیکھ برداشت نہ کر سکتے اور فوراً جواب کے لیے بے چین ہو اُٹھتے ـــــ سر سید سے سیاسیات میں
رکھتے۔ لیکن ذاتی طور پر ان کے بڑے مداح تھے۔ ان کی سیرت و کردار کی پختگی، ان کی اصول پرستی، ان کے
کے حب اسلام کی داد برابر دیتے رہتے۔ خود بھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کتنی تجویزیں سوچتے،
بناتے رہتے۔ اور جہاں تک بس چلتا ان پر عمل بھی کر گزرتے۔

طبیعت حسن پرست پائی تھی، فارسی شاعری میں کھل کھیلتے اور معاملہ بندی کو بڑے لطیف
کی حد تک پہونچا دیتے۔ بمبئی اور جنجیرہ کی تلمیحوں کو تو یار لوگ لے اڑے اور بدگمانی اور مبالغہ کے زور سے
بنا دیا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ بات سرے سے بے اصل ہو۔ اور مولانا کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے
ضروری ہے کہ عمل ہی میں نہیں بلکہ خیال اور دماغ میں بھی انھیں بے نفس اور معصوم تسلیم کر لیا جائے۔

مولانا کا سب سے بڑا وصف ان کا مشغلۂ علم تھا۔ کتب بینی ان کی غذا تھی اور مطالعہ ان کا
انھیں کتب خانہ دے دیا جاتا تو بس اب انھیں نہ کھانے پینے کی پروا تھی نہ سونے کی۔ ان کا سب سے
ان کا کتب خانہ ہی تھا۔ یہ ذوق ان کی اصل طبیعت و سرشت بن گیا تھا اور چونکہ یہ حال تھا، محض قال نہ تھا،
آورد نہ تھی اور تکلف و تصنع کو اس میں دخل نہ تھا۔ اس لیے ان کا یہ ذوق متعدی بھی تھا۔ اور دوسروں کو
ساتھ منتقل کر دیتا تھا اور جو اُن کی صحبت میں اٹھا بیٹھا وہ خود بھی اگر مصنف نہیں تو مضمون نگار تو بن ہی گیا۔
جمال ہم نشین در من اثر کرد" کی تصدیق۔

(۲) مصنف

شخصیت کی جھلکیاں آپ دیکھ چکے۔ اب ذرا مصنف پر بھی ایک سرسری، اچٹتی، نظر ہو جائے۔

مولانا اپنی جگہ بولنے والے بھی بہت اچھے تھے۔ اور ملک کے اونچے خطیبوں، مقرروں میں گنے جاتے تھے۔ لیکن ان کا اصلی جوہر کمال خوش تقریری نہیں، خوش تحریری تھا۔ اور ان کی شہرۂ آفاق عظمت کا نقیب زبان نہیں قلم تھا۔ مصنف اردو نے اور بھی اچھے اچھے پیدا کیے ہیں۔ کسی نے تاریخ نگاری میں نام پایا۔ تو کسی نے ادب و

انشاء کا جادو جگایا۔ ایک نے دینیات میں اللہ و رسول کے فرمان سنائے۔ تو دوسرے نے قصے کہانیوں کے چٹخارے دکھائے تنوع یا رنگا رنگی کی دولت شبلی ہی کی نصیب میں آئی۔ تاریخ ہو یا سوانح نگاری، شعر ہو یا نقد شعر، کلام ہو یا فلسفہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا۔ اب چاہے وہ چھوٹا سا مقالہ ہو یا بڑی سی کتاب، لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ مستقل کتابیں لکھیں تو وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اتنی الگ جیسے ایک طرف شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر، دوسری طرف سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الغزالی اور سوانح مولانا روم اور سب سے بڑھ کر سیرۃ النبی۔ تیسری طرف الکلام اور علم الکلام اور چوتھی طرف متفرق مقالے۔ جیسے جزیہ اور کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین اور مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔ بیسیوں کیا پچاسوں کی تعداد میں پانچویں طرف الندوہ میں برسوں تک لکھے ہوئے نوٹ اور شذرے۔ اور سالہا سال تک لکھے ہوئے شاگردوں، عزیزوں، دوستوں کے نام خط، چھٹی طرف عربی میں لکھا ہوا جرجی زیدان کی تنقید و تردید میں الانتقاد۔ چھ سمتوں کے بعد اس شش جہت میں کوئی سمت باقی نہیں۔ اس سارے ضخیم دفتر میں جہاں سے جس نوشتہ کو بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے، مصنف کے اونچے معیار سے گرا ہوا آپ نہ پائیں گے۔ اور مصنف کی زبان حال یہی صدا لگاتی ہوئی سنائی دے گی۔

2

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

موضوع جو کچھ بھی ہو۔ تصنیف و تالیف بجائے خود ایک فن ہے جس کے اپنے قاعدے ہیں۔ ضابطے ہیں، اصول ہیں، تنوع میں شبلی کو یکتائی فن تصنیف میں حاصل تھی۔ رزم ہو یا بزم، دونوں کا سماں یکساں صحیح کھینچ دینے میں طاق، موزوں لفظ، مناسب فقرے متناسب ترکیبیں لانے میں مشاق۔ کوئی استدلال کریں گے۔ تو ایسا معقول کہ پہلے ہلہ میں تو آپ کا دماغ ان کے ساتھ ہی ہو جائے گا۔ رنج کا نقشہ کھینچیں گے تو ایسا کہ آپ پر بھی جذبہ غم طاری ہوئے بغیر نہ رہے۔ مقام مسرت کی مصوری کریں گے تو ایسی کہ آپ کے دل کا کنول آن کی آن میں کھل ہی جائے۔ کسی شعر کی گرہ کھولیں گے تو ایسی کہ آپ کا بھی وجدان جھوم جھوم اٹھے۔ معرکہ حرب و ضرب کی تصویر دکھائیں گے تو ایسی کہ خود آپ کی رگ شجاعت جوش میں آجائے!

قلم پر یہ قدرت۔ وہ بھی ایسی ہمہ گیری، اس جامعیت کے ساتھ کمتر ہی کسی مصنف کے نصیب میں آتی ہے۔ پڑھنے والے گویا موم کی گڑیا ہیں کہ لکھنے والے نے جب اور جدھر چاہا ان کی ناک موڑ دی اور انہیں پتہ بھی نہ چلنے پایا۔

تصنیف و تالیف جب خود ایک مستقل آرٹ ٹھہرا تو آرٹسٹ یا فن کار کے لیے لازم ہے کہ اسے ناظرین یا سامعین کی طبیعت و جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو، عبارت دقیق ہو۔ ثقیل نہ ہو، سادہ ہو پھیکی نہ ہو، سلیس ہو، سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو خشک نہ ہو، عام فہم ہو، عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو، رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو، ٹھس نہ ہو، فکر انگیز ہو، مگر دور کرنے والی نہ ہو، پر زور ہو مگر پر شور نہ ہو۔ شبلی اسلوب بیان کی ان باریکیوں کے اور لطافتوں کے نزاکتوں کے محرم راز تھے۔

ہر جگہ انھیں خوب برتا ہے۔ اور ان حقیقتوں کو بار بار پرکھ کے دکھایا ایسے ایسے چٹکلے تو گویا ان کی جیب میں رہتے تھے یہ
موضوع پر عبور اور اس کے لیے پوری تیاری مایہ تو گویا فن کی ابجد ہے۔ شبلی جو کچھ کہنا چاہتے پہلے اس کے متعلق خوب
پڑھ لیتے۔ اس کے مالۂ وما علیہ کو نظر کے دائرہ میں لے آتے۔ جب جا کر کہیں قلم اٹھاتے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے
کہ اپنی تحریر میں خوددار و مخلص تھے۔ وہی لکھتے جو اُن کی فہم و بصیرت میں آچکا ہوتا۔ جسے ان کا ضمیر قبول کیے ہوتا اپنے قلم
کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ کرایہ کا ٹٹو بن کر رہ جائے اور جس کا جو جی چاہے فرمائش کر کے اُن سے لکھوا لے۔

علمی مضمون کو ادا کرنے میں شبلی کے قلم کو اپنے معاصرین میں کاملیت کا شرف حاصل ہے اور زبان کا امتیاز خصوصیت
اس کی ابتداء بے شک سرسید نے کی۔ لیکن فن کا بانی عموماً فن کا خاتم نہیں ہوا کرتا۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد ان سے چند قدم
آگے بڑھے۔ اور سماوات اور مبادی الحکمۃ میں فلکیات اور منطق کے ہفتخواں خاصی حد تک سر کر ڈالے۔ لیکن اسے حد کمال تک
پہونچانے کا شرف شبلی ہی کے لیے اُٹھ رہا تھا۔ کوئی سا بھی علمی مضمون ہو شبلی کے ہاں عبارت میں کہیں سے بھی جھول
نہ ملے گا۔ اور نہ کہیں سے اناڑی پن کھلنے پائے گا۔ اور یہ شرف معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب علم و ادب
گزرے ہیں۔ ناول اور افسانے میں انھوں نے واقعی قلم توڑ دیئے ہیں لیکن انھیں کا کوئی علمی مضمون، فلسفہ و ریاضی وغیرہ
پر اٹھا کر دیکھیے صاف نظر آجائے گا کہ اس میدان میں آکر وہی قلم فصاحت رقم شگفتگی سلاست، حلاوت، فصاحت کی جگہ
کیسا تعقید و اغلاق کے دلدل میں پھنس گیا ہے۔ شبلی اس حیثیت سے اپنی بس آپ ہی نظیر گزرے ہیں۔ اب ان کے زمانے
کو بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اتنے دنوں میں زبان کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ محاورے بدل گئے، ترکیبیں نئی نئی چل پڑیں
لیکن شبلی کے طرز اسلوب پر اوس اب تک نہیں پڑنے پائی، کہنا چاہیئے کہ وہی کس بل، وہی دم خم، تازگی لیے ہوئے
وہی نمونہ اب بھی خاصی بڑی حد تک موجود و محفوظ۔

اور ہاں لیجیے ایک بات تو کہنے سے رہ گئی۔ مذہبیت مولانا کی تصنیفی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔ شعر ہو ادب ہو
تاریخ ہو، سوانح عمری ہو، کچھ ہو، مولانا متکلم سب سے پہلے تھے اور کچھ اور بعد کو۔ شعر العجم ایک خاص علمی، ادبی کتاب
ہے، ظاہر ہے کہ شعر عجم کی اس تاریخ و تبصرہ کو مذہب سے کیا واسطہ؟ لیکن نہیں ذرا ملاحظہ ہو کہ گریز سے قبل اس
قصیدۂ ضخیم کو تشبیب میں مولانا کا قلم کس رنگ کا موتی پروتا ہے:۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا۔ اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا۔ لیکن فیض بہ قدر استعداد پہونچا۔
جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی۔ اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی ------ جس قوم میں جس
قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا۔ ترک شجاع تھے۔ شجاع تر ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ سے

تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے۔ اسلام نے ان کو ممتاز کر دیا۔"

نثر کے ساتھ نظم بھی شبلی کی قلمرو میں داخل تھی۔ اور اس میں بھی درجۂ اول میں شامل ہونے کی منتظر ان کی فارسی غزلیں، ان کے فارسی قصیدے اور دوسری فارسی نظمیں ہیں۔ لیکن قسمت نے اس باب میں جس طرح غالب کو، خواجہ عزیز لکھنوی کو اور دوسرے ہندوستانی فارسی گویوں کو محروم رکھا، شبلی کے ساتھ بھی انصاف نہ کیا۔ ایران میں ان کے کلام کی پرسش نہ ہو سکی۔ اور پرسش کیوں کیسے کہ وہاں تک اس کی رسائی ہی نہ ہو سکی۔ اور یہ کام اب ہماری یونیورسٹیوں کے شعبۂ فارسی کا ہے کہ وہ جس طرح بھی بن پڑے، شبلی کے فارسی کلام کو تو ایرانی دانش گاہوں تک پہونچائیں۔

اردو میں مولانا کی چند، ناگنی غزلیں ہیں۔ وہ ان کے ابتدائی زمانے کی ہیں اور ان کی فارسی غزلوں کی ٹکر کی نہیں پھر ایسی بھی نہیں کہ، سرے سے قابل ذکر ہی نہ ہوں۔ گنتی کے چار شعر جو زبانی یاد رہ گئے، ان سے رنگ کلام کا اندازہ کیجیے۔

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے	تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں!

پاس ادب سے رہ گئی فریاد کچھ ادھر	میں کیا کہوں کہ عرش بریں کتنی دور تھا!

تڑپنے کو ہمارے عرصۂ حشر	بھلا ہوتا ہے کیا اتنی زمین سے

شبلی کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے	محشر خرام اور بھی دو اک قدم سہی

آخر زمانے میں مولانا نے "کشاف" کا نقاب چہرے پر ڈال نظمیں بہت ساری کہہ ڈالی۔ سب کی سب سیاسیات اور وقت کے چلتے ہوئے مسئلوں سے متعلق۔ اور یہ مولانا ابوالکلام کے ہفتہ وار الہلال کے افق پر طلوع ہوتی رہیں۔ زیادہ تر مزاحیہ رنگ میں ہیں اور کچھ طنزیہ بھی ہیں۔ اپنی نوعیت میں سب کی سب خوب! ایک مشہور نظم جنگ بلقان کے سلسلہ میں ہے اور ایک دردناک مرثیہ اپنے بھائی کی وفات پر ہے۔ کچھ اور نظمیں مذہبی، اخلاقی عنوانوں پر اس دور سے بہت پہلے کی ہیں۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام کی سا ایک قومی مسدس بھی ہے۔ تیسرے درجہ کی چیز ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ لیکن مولانا کے اردو سرمایہ میں سب سے قیمتی ان کی ایک مثنوی مختصر سی کل ۲۰ صفحہ کی۔ صبح امید کے نام سے سنہ ۱۸۸۴ء یعنی مولانا کے ابتدائی دور کی کہی ہوئی۔

بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر کی ایک چمکیلی مثال۔ مثنوی کا مضمون نہ فاسقانہ ہے نہ عاشقانہ تمام تر قومی یا ملی ہے لیکن موضوع کی اس سنجیدگی کے باوجود ایسی بانکی، ایسی سجیلی، ایسی البیلی کہ گلزار کی اہم ادا۔ اور ترانۂ شوق[1] کی ہم نوا۔ سر سید

---

[1] شوق سے مراد احمد علی شوق ہیں۔ جن کی یہ مثنوی ترانۂ شوق عین اس زمانہ میں نکلی تھی اور اس وقت ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی۔ گو آج گمنام ہو چکی ہے۔

اور ان کو تحریک اصلاح پر ہے اور مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں ہے۔ یہ دھن اس وقت چلی ہوئی تھی اور مولانا اس مثنوی کے خصوصی قدر دانوں میں تھے۔ زیادہ سنانے کا موقع نہیں لیکن دس پانچ شعر تو اِدھر اُدھر سے سُن ہی لیجیے۔ مولانا کے ترنم میں نہیں۔ محض تحت اللفظ۔ قوم مرحوم کا تعارف کراتے ہیں ؎

وہ قوم کہ جان تھی جہان کو — جو تاج تھی فرقِ آسمان کو
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال!
گل کر دیئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کو چلا کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھویں اڑا دیئے تھے — اٹلی کو کنویں جھنکا دیئے تھے

ماضی یہ تھا، رفتہ رفتہ ملکوں اور اقلیموں کے ساتھ علوم و فنون کی دولت بھی اس قوم کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور اب حال یہ ہو گیا تھا کہ ؎

معقول کو فقہ کو ادب کو — ہم ہاتھ سے کھو چکے ہیں سب کو
بیہودہ فسانہ ہائے پارین!! — زلف و خط و خال کے مضامین
وہ نوکِ مژہ کی نیزہ بازی — وہ ترکِ نگہ کی فتنہ سازی
یہ طرزِ خیال تھا ہمارا! — یہ فن یہ کمال تھا ہمارا!
جغرافیۂ وجود سارا — ہر چند کہ ہم نے چھان مارا
کی سیر ہی گرچہ بحر و بر کی — لیکن نہ خبر ملی کمر کی
نالوں کے جب دکھائے تماشے — گردوں کے اُڑا دیئے پرخچے

یہ عالم یاس تھا کہ ایک طرف سے رہبر کی آواز آئی ؎

دیکھا تو وہاں بہ جاہ و تمکین — آیا نظر ایک پیرِ دیریں!
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی!! — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسم

کلام میں کچھ مزہ اگر آیا ہو، تو یہ بے مزہ حقیقت بھی سُن لیجیے کہ آگے چل کر مولانا اس مثنوی سے

(۳) مصنف گر

مولانا کی عظمت کے لیے یہی کیا کم تھا کہ وہ اردو کے عظیم ترین مصنفوں میں سے ایک ہوئے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مصنف تھے۔ ایک مجسم ٹکسال تھے جس سے مصنف اور اہل قلم ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے۔ جن جن کو ان کی اتالیقی اور دست شفقت نے تصنیف و تالیف کی اونچی کرسی تک پہونچا دیا۔ ان کی مکمل فہرست کوئی تیار کرنا چاہے تو اسے خاصی طوالت سے کام لینا پڑے۔ لیکن چند نام لے دینے تو بہرصورت واجب ہیں اور چند کیا معنی جو نام سر فہرست ہے وہ ایک ہی ایسا ہے۔ جو شاگرد کے ساتھ خود استاد کے بھی نام چمکا دینے کو کافی ہے۔ اس ایک سے مراد آپ خود سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا سید سلیمان ہیں جو حقیقی جانشین شبلی اعظم کے رہے۔ ندوہ اور اس کے دار العلوم ہی کے سیاق میں نہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اور پھر آگے چلیے تو نام مولانا عبد السلام ندوی مرحوم اور مولانا عبد الباری ندوی سلمہ اللہ اور ضیاء الحسن علوی مرحوم اور مولوی اکرام اللہ سید ظہور احمد وحشی مرحوم اور حاجی معین الدین احمد مرحوم اور پروفیسر عبد الواجد مرحوم کے بے ساختہ یاد پڑ جاتے ہیں۔ بلکہ اگر باضابطہ شاگردی کی قید اڑا دیجیے تو مولانا ابو الکلام مرحوم اور مولانا عبد اللہ عمادی کے سے بزرگوں کے نام بھی اس صف میں آسکتے ہیں اور اس مقالہ نویس کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ اس بے علمے کو جو کچھ بھی الٹا سیدھا لکھنا لکھانا آیا وہ بس اسی آستانہ کا فیض ہے۔ پہلے تو انھیں حضرت کے مضمون اور کتابیں پڑھ پڑھ کر ان کی نقالی میں کمال پیدا کر کے یہاں تک کہ ان کی خاص خاص ترکیبیں اور لفظ ازبر ہو گئے تھے۔ اور پھر اسی زندہ بساط کے ادنیٰ حاشیہ نشین بن کر۔

اور لیجیے، یہ سارے نام تو صرف ندوہ کے سلسلے کے ہوئے باقی ۱۶ سال مولانا نے علی گڑھ میں بھی تو گزارے اللہ جانے کتنے اہل علم و اہل قلم اس علی گڑھ کے دور میں اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہوں گے۔ سید سجاد حیدر،

خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی، مولوی محمد عزیز مرزا، حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں، اور غالباً میر محفوظ علی بھی، سب سے آخر میں نام وہ یاد پڑا جسے سب سے پہلے یاد آنا چاہیے تھا۔ یعنی بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اسے یہیں ٹانکے دیتا ہوں کہ شبلی جس پایہ کے سخن گو تھے۔ اس سے بڑھکر سخن فہم تھے۔ تنقید کا فن جتنا بھی ترقی کر جائے شبلی نے کلام فارسی پر جو بہترین تبصرے اپنی شعرالعجم میں کر دیئے اور اردو کی رزمیہ شاعری اور فن بلاغت سے متعلق جو مبصرانہ نکتے۔ موازنہ انیس و دبیر میں سپرد قلم کر دیئے ہیں ان سے کوئی طالب علم چاہے ادبیات فارسی کا ہو یا ادبیات اردو کا شاید ہی مستغنی ہو سکے۔ اور طالب علم تو خیر، منتہی ہو جانے کے بعد بھی طالب علم ہی رہتا ہے۔ ان موضوعوں پر جو اچھے منجھے ہوئے اہل قلم ہیں۔ وہ بھی ان کتابوں سے روشنی ہی حاصل کرتے رہیں گے۔ اس طرح جو فلسفہ اور عقلیات پر لکھنے لکھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کے لیے بھی مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ الکلام وغیرہ کو دلیلِ راہ بنائیں اور پھر اس جڑ کو پکڑ کر اس میں پھل پھول جتنے بھی چاہیں پیدا کر لیں۔ واقعاتِ نگاری کے لحاظ سے الفاروق نمونہ کا کام دیگی۔ اور سیرۃ النبی کی تو بعض عبارتیں (خصوصاً ولادت مبارک کے سلسلے میں) اپنی دل کشی دلآویزی اثر انگیزی کے لحاظ سے کلاسیکل یا معیاری ہونے کا درجہ پا چکی ہیں۔ سلاست بیان، تحریر کی ان ساری قسموں میں قدر مشترک ہے اور حسنِ ترتیب کا جہاں تک تعلق ہے شبلی نے دماغ ایسا پایا تھا۔ جیسا شاہجہاں نے تعمیر کے لیے تاج محل کا تو خیر کہنا ہی کیا، باقی جامع مسجد دہلی مسجد اجمیر وغیرہ جس شاہجہانی عمارت کو نظر میں لایئے اس کا نقشہ کتنا سڈول اور کیسا سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آئے گا۔ شبلی بھی شاید نقشہ اسی طرز و انداز کا اپنی ہر تحریر کا چھوٹی ہو یا بڑی اپنے دماغ میں تیار کر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ یہ چیز ان کے لیے امر طبعی بن گئی تھی۔ کسی خاص غور و فکر سوچ بچار کی ضرورت ہی انھیں نہ پڑتی۔ خود بخود وہ ڈھلا ڈھلایا خاکہ ان کے ذہن میں آجاتا۔ اور آگے قلم روانی سے چلنے لگتا۔ ہر تحریر کی جان حسن ترتیب ہوتی ہے شبلی کے ہاں اس کی کمی نہیں افراط تھی۔ ہر بات ایسی نفسیاتی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے کہ سیدھی دل میں اتر جاتی، ذہن پر بار کہیں سے نہ پڑتا اور پڑھنے والا کم سے کم پہلے دہلہ میں تو نیم مسحور سا ہو کر ان کا ہم خیال بن ہی جاتا۔ شرافت اور متانت یہ دو وصف تو جیسے شبلی اپنے قلم کو ساتھ لیے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ ہزاروں صفحہ ان کی تحریروں کے پڑھ جایئے! اور ان میں تحریریں ہر دور کی اور ہر موضوع پر نہ کہیں کوئی لفظ مبتذل ملے گا۔ اور نہ کہیں کوئی ایسا محاورہ یا ایسی ترکیب۔ جس کا بولنا ثقہ زبانوں پر بار ہو۔ جس کا سننا شریفوں کے لیے باعث عار ہو۔

شبلی، روح پر فتوح والے شبلی! تو خوش ہو کہ آج تیری یاد منانے کے لیے ملک و ملت کے اتنے چیدہ و منتخب خوش مذاق علم دوست، بوڑھے اور جوان تیرے مزار پر اور تیرے تصنیف کدہ پر جمع ہوئے ہیں۔ تو جو چراغ جلا گیا

اسی سے بے شمار چراغ آج تک جل چکے ہیں۔ اور آئندہ بھی برابر جلتے رہیں گے۔ رحمت کے فرشتے ان کی عقیدت مندانہ سرگرمیاں تجھ تک پہونچا دیں گے تو مصنف ہی نہ تھا مصنف گر بھی تھا۔ عالم ہی نہ تھا ------- معلم بھی تھا۔ تاریخ نگار ہی نہ تھا، تاریخ ساز بھی تھا۔ تجھے حق تھا کہ دار المصنفین سا ادارۂ تصنیف و تالیف تو نے قائم کر دیا۔ اور دار المصنفین کا حق ہے کہ وہ تیری یاد کی شمع روشن رکھے اور تیری ہی راہ پر چل کر ملت و ملک دین و علم کی خدمت اسی طرح بجالاتا رہے۔